eISSN: 2791-0342
pISSN:2791-0334

رشید امجد کے افسانوی کرداروں کا جائزہ

THE ANALYSIS OF CHARACTERS IN RASHEED AMJAD'S FICTION

Syeda Fasiha Abid
Ph.D Scholar, Urdu Department,
Govt. College University, Faisalabad.

سیدہ فصیحہ عابد
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

Khurram Shahzad Khurram
Ph.D Scholar, Urdu Department,
Govt. College University, Faisalabad

خرم شہزاد خرم
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

ABSTRACT

Rasheed Amjad's fictions contain both internal and external aspects of life of a common man. There are a lot of internal themes in his fictions, on the other hand, the external aspect has also been the representative theme of his fictions. He has a special skill in highlighting the psychological aspects of life. At the same time, the voice of Marxist perspective also echoes in his fiction. Rashid Amjad's heart beat for the common people, that's why he wanted to create a society where not only the wealthy but also the common people could live happily. That's why, he used to make subject of his fiction, the stories of the common people.

KEYWORDS

Fiction, Characters, Analysis, Ideal Man, Psychological aspects, Inner, Marxist

رشید امجد کے ابتدائی دور کی کہانیوں میں موضوعات چونکہ ٹھوس ہیں۔ زندگی کے اصل حقائق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس لئے اسلوب میں بیانیہ انداز دکھائی دیتا ہے۔ زندگی، جس کا ڈھانچہ سیاسی، تمدنی، معاشرتی، معاشی، مذہبی واخلاقی قدروں سے تشکیل پاتا ہے۔ اس زندگی کا ہر زاویہ اسلوب کی رنگارنگ جہتوں کے ساتھ نمایاں ہے۔ کہیں سیاسی بے اعتدالیاں ہیں، کہیں معاشرتی ناہمواریاں، کہیں اخلاقی زوال کی بات ہے اور کہیں معاشی تنگ دستی اور پریشان حالی اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ ہر جگہ اسلوب میں موضوعات کی ایک نئ جہت اور موضوع کے حوالے سے اسلوب میں جدت نظر آتی ہے۔ ایک فکری لہر بھی غیر محسوساتی طور پر اس بیانیہ انداز کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو شاعرانہ آہنگ کے ساتھ بیانیہ کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

وہ بدبودار گلی، وہ سیلن میں بھیگا ہوا کمرہ، وہ میلا بستر اور ہوٹل کی وہ پرانی میز، جس میں میلی پلیٹوں میں کھانا کھاتے ہوئے اس نے عمر کے کئی تھان وقت کی چرخی پر لپیٹ دیئے تھے۔''(1)

بقول ڈاکٹر مجید مضمر:

''ان کے یہاں جو شعری فضا ملتی ہے۔وہ بیانیہ کو زیادہ تخلیقی، زیادہ توانا اور زیادہ پُراسرار بنا دیتی ہے۔''(2)

بعض اوقات بیانیہ بغیر شعری فضا کے براہِ راست اور زیادہ موثر ہو جاتا ہے۔یہاں رشید امجد کا معاشرہ، اس کے مخصوص رویے بہت نمایاں اور ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

اعلیٰ کردار کا حامل

رشید امجد کے بیانیہ انداز میں نہ صرف معاشرتی زندگی کی حقیقی تصویریں ملتی ہیں بلکہ اسلوب میں روانی اور وضاحت کا عنصر بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔اپنے عہد کے منفی رویوں پر طنز و تنقید کا رنگ بھی ابھرنے لگتا ہے۔

''ہاں یہاں تو ہاتھ کھڑا کرنا، اور ہاتھ کھڑے کروانا ایک کاروبار بن چکا ہے۔اور کاروبار کے لئے کھنکتے اور چمکتے سونے کی ضرورت ہے اور یہ کھنکتا، چمکتا سونا ان کے پاس نہیں، جو سچ کی تلاش کرنا چاہتے ہیں۔''(3)

رشید امجد کے افسانوں کے کردار اعلیٰ کردار کے حامل ہیں ہر طرح کی صورت حال سے نپٹنے کے لیے تیار رہتے ہیں

''پھر اس نے باقی تینوں کی طرف دیکھا۔ یہ ہمارا دشمن اور زمین کا غدار ہے۔ ہمیں اس کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔''(4)

رشید امجد نہ صرف اپنے کرداروں کو اعلیٰ کردار دکھاتے ہیں۔ان پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے کردار سماجی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

نفسیاتی کردار

رشید امجد کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کی نفسیاتی نشوونما کرتے رہتے ہیں۔ان کے کردار نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں اور وہ اپنے کرداروں کو ان الجھنوں میں سے نکال کر ان کی نفسیاتی نشوونما کرتے نظر آتے ہیں۔نفسیاتی نشوونما کے حوالے سے ان کا افسانہ عکس دیدہ چراغ اہم مقام رکھتا ہے۔یہ افسانہ ہمیں یکسر اچھوتے اور نئے افق سے آشنا کراتا ہے۔

اس کہانی کا مرکزی کردار نفسیاتی الجھن کے زیر تسلط ایک ایسے خوف میں گھرا ہوا ہے جو مرور ایام کے ساتھ اس کے اندر زندہ حقیقت کی طرح پلتا رہتا ہے۔پھر ایک دن وہی خوف روحانی تجربے اور واردات کی پیشکش کے دلچسپ بیانیے میں ڈھل جاتا ہے۔کہانی کے

مرکزی کردار کا خوف اس کی ذات کا مکمل حصہ بن چکا ہے۔ وہ اکیلے رہنے سے ڈرتا ہے۔ اس کہانی کا نقطہ کمال وہ مقام ہے جب میز بان قدوس اور ریحانہ سے متعلق یہ انکشاف کرتے ہے۔ گزشتہ سال وہ اسی کمرے میں تھے رات کو گیس کا ہیٹر کھلا رہ گیا تھا۔

اسی طرح کا ایک نفسیاتی تجربہ ان کا افسانہ جواز بھی ہے جو مجموعہ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں شامل ہے۔ ان دونوں کہانیوں کا پیشکش مختلف ضرور ہے مگر تجربے کا بیان قدرے مشترک ہے جو اس کا مرکزی کردار جب دوسروں کے مسلسل دھوکے اور فریب سے زندگی کا اعتبار کھونے کو ہوتا ہے۔ تو منور نامی ایک نوجوان کردار جو ایم اے فائنل ائیر میں ہوتا ہے دھوکے اور فریب کے مقابل قوت کے طور پر زندگی کا اعتبار قائم رکھنے آن پہنچتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار جو منور کے مشوروں کی بدولت آسودگی کی معراج پر پہنچتا ہے تو شکریہ کے لیئے اس کے گھر جاتا ہے وہاں پہنچ کر جب وہ منور کی بابت پوچھتا ہے تو ادھیڑ عمر جو گھر کا دروازہ کھولتا ہے اسے یہ بتا کر حیران اور ایک حد تک پریشان کر دیتا ہے۔ منور تو اب اس دنیا میں نہیں اور اس دنیا سے گزرے دو سال سے بھی کچھ زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ منور نہیں تو کون تھا جو اس کے زندگی کا اعتبار بخش گیا۔

منور نامی یہ کردار کہانی کے مرکزی کردار کی نفسیاتی نشو و نما کر گیا۔ وہ شخص زندگی کی پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا منور نے کسی فرشتے کی طرح اس کی مدد کی۔ اسے نفسیاتی الجھنوں سے نکال کر زندگی کی رہ میں ڈال دیا۔ قرآن مجید میں بھی ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک لوگوں کے ہمراہ فرشتے مقرر کرتا ہے اور جب صالح لوگ کسی خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا کسی مشکل میں پڑ جاتے ہیں تو فرشتے بڑھ کر ان کو تھام لیتے ہیں بالکل اسی طرح سے "منور نامی اس کردار نے کہانی کے مرکزی کردار کی نفسیاتی نشو و نما کی ہے۔ رشید احمد پہلے افسانوی مجموعے "بیزار آدم کے بیٹے" میں ایک لڑکی کا کردار نہایت خوبصورت انداز سے پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی کردار ہے جو کہ تصویریں بنانے کا شوقین تھا۔ رشید امجد کہتے ہیں کہ وہ جب بھی اسے چھونے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ رنگوں کی پیالی میں ڈبکی لگا جاتی ہے۔

یہ افسانہ بھی کرداروں کی نفسیاتی نشو و نما کرتا ہے۔ رشید امجد کے ہاں جملے تیز دھار آلے سے زندگی کی ناآسودگیوں پر وار کرتے ہیں۔ افسانہ ''ڈوبتی پہچان''میں فرد نفسیاتی الجھنوں وسوسے اور خوف کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ اس افسانے میں نفسیاتی الجھن کی مثال قبرستان پکا کروانے کی ہے جہاں اس نے ماں کی قبر کو پختہ کرانے کے چکر میں پورا قبرستان ہی پکا کرا دیا، مگر وسوسوں نے پیچھا نہ چھوڑا اور یہ خیال گردش کرنے لگا کہ پتا نہیں ماں کی قبر اس قبرستان میں ہے بھی یا نہیں۔

عام آدمی کا کردار

رشید امجد نے ستر کی دہائی میں آدمی کو "بیزار آدم کے بیٹے" کے طور پر پہچانا تھا۔ جدید ادب، بیماری اور بے زاری اور ان کے نو بہ نو مظاہر سے جھوجھتا رہا ہے۔ سرد جنگ، نوآبادیاتی بوجھ، آمریتوں کے تسلسل اور سنتالیس میں دیکھے گئے خواب کی شکست کے ہمہ وقت احساس نے یہاں کے عام آدمی کو بیمار اور بے زار ہی کر ناتھا۔ رفتہ رفتہ رشید امجد نے "بیزار آدم کے بیٹے" کو عام آدمی کے طور پر پہچاننا شروع کیا۔ وہ

اپنے افسانوں کو عام آدمی کے خواب کہتے تھے، ایسے خواب جو پوری جدوجہد کے باوجود تعبیر نہ پاسکے اور اگلی نسل کو منتقل ہو گئے۔ عام آدمی نے اپنی اگلی نسل کو بس یہی کچھ ورثے میں دیا۔ ایک تخلیق کار کے طور پر یہی رشید امجد کا گہرا دکھ تھا۔

رشید امجد جانتے تھے کہ عام آدمی، بیسویں صدی کی آزادی کی تحریکوں کی تشکیل' کے لیے تیاری ضرورت رہا ہے۔ آزادی کی کوئی تحریک، عام آدمی کی آزادی کو منشور بنائے بغیر ممکن نہیں مگر اس تحریک کے قائد عام طور پر عام آدمی نہیں ہوتے یا جب وہ قائد بنتے ہیں تو وہ عام آدمی نہیں رہتے۔ اس طور عام آدمی اپنی آزادی کا خواب، خاص طبقے لفظوں خاص الفاظ اور بیانیوں میں دیکھتا ہے۔ یہ کوئی معمولی تناقض نہیں ہے۔ یہی تناقض عام آدمی کو اس کی آزادی سے دور رکھتا ہے اور اس کی جدوجہد کو مشقت میں تبدیل کرتا ہے۔ رشید امجد کے یہاں یہ الم ناک احساس موجود تھا کہ عام آدمی اپنی آزادی کی ذمہ داری خود لینے کے بجائے دوسروں کے سپرد کرتا ہے۔

آسٹریائی ماہر نفسیات ولہلم رائخ کا اپنی کتاب 'سن! او بالشتیے (1946)' میں یہ نکتہ کہ 'صرف تم ہی اپنے نجات دہندہ ہو سکتے ہو'' رشید امجد کے افسانوں کی تہ میں کارفرما ہے۔ عام آدمی کی پیہم بے اطمینانی اسے خواب دیکھنے یعنی اپنی حقیقی صورتِ حال سے خلاصی پانے کی مہم جوئی کی تحریک دیتی ہے، مگر وہ اپنے تخیل کو حقیقت سے ہم آہنگ نہیں کر پاتا اور خواب دیکھنے کی مہم جوئی جاری رکھتا ہے۔ یہی اس کی تقدیر ہے۔ رائخ کے ہاں عام آدمی کو اس کی صورتِ حال کا ذمہ دار قرار دیا گیا جو اپنے بجائے مسولینی، نپولین، ہٹلر اور سٹالن کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا ہے، جب کہ رشید امجد کے ہاں عام آدمی (جہاں تک وہ سماجی سیاسی صورت حال میں اپنی تلاش کا سفر جاری رکھتا ہے) کی بدتر صورتِ حال کی ذمہ داری اس دنیا پر ہے جس میں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کی جدوجہد کرتا ہے۔

رشید امجد کے افسانوں کے عام آدمی کے تصور اور آزادی کی تحریکوں (خواہ وہ سیاسی ہوں یا ادبی) کے عام آدمی کے تصور میں ایک مشترک قدر یہ ہے کہ دونوں میں عام آدمی کو اوج و رفعت سے ہمکنار کرنے کی کوشش ہے۔ مگر ایک اہم فرق اس ضمن میں یہ ہے کہ آزادی کی تحریکوں کے عام آدمی کو خارجی طور پر وان چڑھایا ہے، تاکہ اسے متحرک کیا جاسکے جب کہ رشید امجد کے یہاں داخلی طور پر عام آدمی پروان چڑھانے کی سعی ہے تاکہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پاسکے اور شناخت حاصل کر سکے۔

رائخ کا بالشتیہ سماجی و ثقافتی تناظر میں اپنے وجود کی رمز سے آشنا ہوتا ہے اور رشید امجد کا عام آدمی مابعد الطبیعیاتی سیاق میں اپنی ہستی کی رمز تک رسائی کی کوشش کرتا ہے۔ مرشد سے ملاقات کے بعد یہ ظاہر لگتا ہے کہ رشید امجد کے عام آدمی نے اپنی شناخت کے اس رفیع تصور کی منزل سر کرلی ہے جس کا وہ ہمیشہ خواب دیکھتا رہا ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ ان کا عام آدمی اپنے خوابوں کی کھڑکی کھلی رکھنا چاہتا تھا۔ ایک ایسے زخم، ایک ایسی صورتِ حال کو برقرار رکھنا چاہتا ہے جو اسے اس کی انسانی سطح پر قائم رکھے اور اس کے دل میں مسلسل سفر کی آرزو کا چراغ جلائے رکھے۔

رشید امجد کا عام آدمی تیسری دنیا کے ایک نوآزاد ملک کے بڑے شہر میں مقیم ہے۔ وہ زیادہ تر ایک سرکاری دفتر کا ملازم ہے؛استاد ہے، بگل والا ہے اور سب سے بڑھ کر خواب دیکھنے والا ہے۔ یوں تو اس کے خواب کئی ہیں: ترقی، خوشحالی، عزت نفس اور اپنی ذات کی تکمیل ؛بنیادی خواہشوں سے لے کر خواہشوں کے جبر سے آزادی کے خواب، مگر ان سب خوابوں کی تہ میں شناخت کے ایک رفیع تصور کو اپنا حقیقی تجربہ بنانے کی شدید آرزو پائی جاتی ہے۔ان کے ابتدائی افسانوں میں شناخت کا مسئلہ، سماجی، سیاسی جبر سے آزادی کی کوشش میں اپنا اظہار کرتا ہے۔آگے چل کر شناخت کا سوال مابعد الطبیعیاتی حدودں میں داخل ہوتا ہے۔ان کا افسانہ عام آدمی کی جذباتی ،ذہنی اور روحانی جدوجہد اور نشوونما کا بیانیہ بنتا ہے۔

مرشد کا کردار

رشید امجد کے ہاں تصوف کے موضوعات نہ صرف جامعیت کے ساتھ ابھرے ہیں بلکہ ان کا مخصوص لب ولہجہ، زبان وبیان، متصوفانہ اصطلاحیں، بصیرت وبصارت کا تصادم، حکایات، تمثیلی انداز، خود آگہی کی مختلف منازل، روحانی تحیر کے ارتقائی مراحل ان کے اسلوب میں سب سے جدا اور ان کی ایک منفرد پہچان بنتے ہیں۔ تصوف کی تعریف اور اس کا مفہوم موضوع اور زبان دونوں کے حوالے سے مکمل ہوتا ہے۔زبان کے اندر تاثر اور کیفیت کا ہونا بھی از بس ضروری ہے رشید امجد نے متصوفانہ موضوعات کو ان تمام حوالوں سے برتا ہے۔دائرہ معارف اسلامیہ میں تصوف کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

> تصوف مادہ میں ت۔ص۔و۔ف عربی کے باب تفعل سے مصدر ہے جس کے معنی ہیں اپنے آپ کو صوفیانہ زندگی کے لئے وقف کرنا۔۔۔اس سے بے شمار ایسے الفاظ مشتق ہیں جو تصوف کے بعض بنیادی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں"۔(5)

مثلاً صفا(پاکیزگی)اور صفو(برگزیدہ) صفی(خالص دوست)۔۔تصوف کے موضوع پر لکھنے کے لیے مخصوص زبان وبیان اور اسی حوالے سے مخصوص لسانی سانچوں کی ضرورت ہوتی ہے۔انتظار حسین اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''تصوف کی روایت ایسے سانچوں کو جنم دیتی ہے جن کے راستے ہم اپنا اظہار کرتے رہتے ہیں۔اور قلب و نظر کی سطح پر زندہ رہتے ہیں ہمارے اندر جو شاید مر گئی ہے اسے زندہ کرتے ہیں جو علاقے خشک ہوگئے ہیں۔یعنی ان کے طفیل ہمارے دل گداز رہتے ہیں اور شعر اور افسانے کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔''(6)

ان عوامل اور حقائق کی روشنی میں بھی اس نکتہ اور پہلو کو خاصی تقویت ملتی ہے۔رشید امجد نے نہ صرف تصوف کے موضوعات کو جامعیت کے ساتھ اپنے افسانوں میں برتا ہے بلکہ مخصوص زبان وبیان اور اظہار کے سانچوں میں تصوف کی روایت کے بانی بھی ہیں۔یہ وہ دنیا ہے وہ روحانی سفر ہے، جس کی ہر قدم پر کیفیت بدلتی ہے۔ہر کیفیت کی اپنی زبان ہے اس دنیا کی ہر کیفیت اسرار سے بھری ہوئی ہے۔

کشف اس وادی میں قدم قدم پر بکھرا ہوا ہے۔ رشید امجد کا اسلوب ہمہ جہت ہے۔ اس کا کوئی ایک حوالہ کوئی ایک مخصوص رنگ نہیں خود اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''اسلوب کی ساری صورتیں میرے مجموعی اسلوب کی مختلف پرتیں ہیں اور میرے بنیادی موضوع شناخت اور پہچان کے تصور سے جڑے ہوئے ہیں۔ داخلی شناخت اور انکشاف ذات کا سفر ابھی جاری وساری ہے اس کی نہ تو کوئی منزل ہے نہ انتہا۔''(7)

اب تک کے آخری افسانوی مجموعہ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں بھی یہ انداز، یہ داخلی لذت جوں کی توں ہے۔ پھر سے تلاش حقیقت، ارتقائے حیات کے مرحلے مرشد وجود کی دوری سے پھر ذات کی اکائی میں ضم ہو چکا ہے مسخر ہونے سے تسخیر کرنے کے مراحل باقی ہیں۔:

''شاید روشنی مجھے ایک نیا قالب دے دے۔ اس نے سوچا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگا لیکن جوں جوں آگے بڑھتا وہ اور دور ہوتی جاتی ہے۔"(8)

اس تمام صورت حال سے یوں لگتا ہے کہ انسان کو ایک مخصوص وقت اور عمر کے مخصوص حصے میں جب روحانی بیداری اور صداقت درکار ہوتی ہے تاکہ ذات اور کائنات سے متعلق اس کا شعور پختہ ہو کر ایک مخصوص راہ کا تعین کرے۔ مرشد یہیں کہیں وجود پاتا اور پا سکتا ہے یہ داخلی اور انسانی شعور و آگہی کی تشکیلی اور تکمیلی صورت ہے۔ یہ ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ رشید امجد کا مرشد اس حوالے سے فارغ البال ہو چکا ہے۔ یہاں اسلوب میں انسان کی داخلی اور خارجی کیفیات حقیقی منظر نامے کے عکس میں کندھی ہوئی ہیں۔

رشید امجد کے یہاں اکثر خیال، جذبہ اور منظر کشی صرف ایک دوسرے سے گھلے ملے ہی نہیں ہوتے بلکہ ان سب کے سرے ایک دوسرے میں بری طرح پیوست ہوتے ہیں۔ یہ ان کے فن اور فکر کی اکائی بھی ہے۔ یہ اسلوب کے داخل اور خارج کے ایک مخصوص جہت ہے اسی سے ان کا تخلیقی پروسس جاری وساری رہتا ہے اور اسلوب میں گہری معنویت بھی پیدا ہوتی ہے۔ رشید امجد کے عام آدمی کے خواب اسے بالآخر الذکر مرشد اور شیخ کے تصور تک لے گئے۔ مرشد کا کردار بڑی حد تک حلاج کا پروٹوٹائپ ہے۔ شاید اس لیے کہ حلاج بھی ایک عام آدمی، دھنیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مرشد کا کردار، ان کے عام آدمی کے کردار ہی کا ایک رخ ہے۔ 'شبِ مراقبہ کے اعترافات کی کہانیاں' میں مرشد اچانک ظاہر ہوتا ہے؛ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ مراقبہ کی کیفیت میں کشف کی صورت نمودار ہوتا اور عام آدمی کی راہ نمائی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عام آدمی کے اندر ہی اس کا راہ نما موجود ہے۔ وہ خود ہی اپنا ہادی و رہبر ہے۔

''مرشد اسی شام مل گیا۔ لمبی سیر کے بعد ذرا ستانے کو وہ سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھ گیا، مرشد ساتھ آ بیٹھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں تو تمھیں جانتا ہوں۔ اس نے مرشد سے کہا۔"(9)

رشید امجد اپنے تازہ تر افسانوں میں مرشد کا ذکر کرتا ہے، مگر اس میں 'ولندیزی یا اطالوی تصوف' (بذریعہ شہاب واشفاق) کا شائبہ دکھائی نہیں دیتا، یہ متکلم کے اپنے وجود میں اس کے قلب کی نہیں، ذہن کی عکاسی کرتا ہے، دوسرے وہ جان بوجھ کر اپنے بیانیے کو داستان یا تذکروں کی زبان سے آراستہ نہیں کرتا، اپنے عہد میں اسلام آباد میں ہی بولی جانے والی زبان کو فوقیت دیتا ہے۔

''پچھلے چھ سو سالوں سے تم نے علم کی دنیا میں ایک کومے کا بھی اضافہ نہیں کیا،'' مرشد نے جواب دیا۔"(10)

بات یہ کہ رشید امجد کے افسانوں کا مرکزی کردار پہچان کے ایک موڑ پر پہنچتا ہے تو وہاں سے تلاش کا ایک اور سفر شروع ہو جاتا ہے' کبھی پہچان کی تلاش اسے خارج کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ اور کبھی باطن کے ان پُر پیچ راستوں پر جہاں تک رسائی آسان نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے ایک خواب ہے جو اسے بے چین رکھتا۔ ایک شناخت ہے جو مکمل نہیں ہو پا رہی۔ لیکن اس سارے عمل میں امید کی ایک رو زیرِ زمیں چل رہی ہوتی ہے۔ یہی امید، ارتقا اور تحرک رشید امجد کی اپنی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ کبھی اس کا دل اس گم شدہ ثقافت کے لیے بے چین نظر آتا ہے جس کے رنگوں سے اس کی شخصیت کی تشکیل ہوئی تھی۔ کبھی تشخص، پہچان، اور شناخت کا ست رنگا پرندہ ایک جھلک دکھاتا ہے اور پھر وقت کی بہتی ہوئی دھند میں کھو جاتا ہے اور کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ اس ست رنگے پرندے کے رنگ اور چمک صرف اسی کو دکھائی دیتے ہیں۔

متمتع اور کوشش

امجد کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں کوشش نظر آتی ہے۔ ناامیدی کا عنصر موجود نہیں۔ اس کی بہترین مثال ان کا افسانہ "سمندر قطرہ سمندر" ہے۔ اس میں ٹیکسلا کے کھنڈرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر انہیں کھنڈرات سے ٹیکسلا کو نیا جنم ملتا ہے۔:

''جی ہاں یہ ٹیلہ کبھی مندر تھا جہاں گوتم کی داسیاں گیت گایا کرتی تھیں۔"(11)

لیکن وقت اور لوگوں کی کوششوں نے ٹیکسلا کی صورت کو بدل دیا ہے آج وہاں ہیوی کمپلیکس بن رہے ہیں۔ وہاں ایک بڑی اسلحہ ساز فیکٹری قدم جما رہی تھی سارے علاقے پر چھائی ہوئی دھوئیں کی چادر ٹیکسلا کی نئی زندگی کی نوید دے رہی تھی مدتوں سے سویا ہوا ہے عظیم شہر آنکھیں مل رہا تھا۔ میں خوشی سے ناچنے لگا تھا ٹیکسلا سانس لے رہا ہے۔ دشت امکان اس افسانے میں کہانی کا موضوعاتی احاطہ متمتع اور کوشش ہے۔

یہ افسانہ مکمل جدوجہد پر مبنی ہے۔ خوابوں کی ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کی جدوجہد ہے۔ خواب بھی ایک خزانے کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کا اچھوتا اور لطیف اظہار یہ ہے کہ یہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔

یہ کہانیاں ایک عام آدمی کے وہ خواب ہیں جو اس نے زندگی بھر دیکھے لیکن تمام تر جدوجہد اور خواہشوں کے باوجود تعبیر نہ پا سکے کیوں کہ وہ ایک عام آدمی تھا، کیوں کہ وہ ایک عام آدمی ہے۔ایک عام آدمی کے گھر پیدا ہوا۔

ایک عام آدمی کی حیثیت سے جیا اور ایک عام آدمی کی حیثیت سے مر گیا لیکن اس نے خواب دیکھے اور خواب وراثت میں منتقل ہوتے جاتے ہیں وراثت میں منتقل کرنے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں سو اس نے اپنے خواب اپنے بیٹے کو اسی طرح منتقل کر دیے۔

اعلیٰ کردار

رشید امجد کے تخلیق کردہ کردار اعلیٰ کردار کے حامل ہیں۔وہ تمام خوبیوں کا مرقع ہیں۔ان کے کردار کے ہیں باہمت نظر آتے ہیں کہیں مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن رشید امجد کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف اپنے کرداروں کو اعلیٰ کردار کے حامل نہیں دکھاتے بلکہ ان پر طنز اور تنقید بھی کرتے ہیں۔رشید امجد کے بیانیہ انداز میں نہ صرف معاشرتی زندگی کی حقیقی تصویر ملتی ہے بلکہ اسلوب میں روانی اور وضاحت کا عنصر بہت نمایاں ہوتا ہے۔

> ''ہاں یہاں تو ہاتھ کھڑا کرنا اور ہاتھ کھڑے کروانا ایک کاروبار بن چکا ہے اور کاروبار کے لیے کھنکتے اور چمکتے سونے کی ضرورت ہے اور یہ ان کے پاس نہیں جو سچ کی تلاش کرنا چاہتے ہیں۔"(12)

رشید امجد نہ صرف اپنے کرداروں کو اعلیٰ دکھاتے ہیں بلکہ ان پر تنقید بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے کردار سماجی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔رشید امجد کے افسانے کے کردار اصول و ضوابط کے پکے ہیں۔اپنے اصولوں پر کسی قسم کا کوئی کمپرومائز نہیں کرتے۔ضمن میں ان کے افسانے لیمپ پوسٹ میں چوہدری صاحب کا کردار بہت اہم ہے۔جو آخری وقت تک اپنے اصولوں کے پابند رہے۔یہاں تک کہ اپنی بیٹی کی ضد کے سامنے بھی نہ جھکے۔آپ کے افسانوں میں ایک حوالہ پیکر تراشی کا حوالہ ہے موجود سے نا موجود تک دوسرا ناموجود سے موجود کی جانب ہے۔پیکر تراشی کے عمل میں رشید امجد محسوسات سے گزرتے ہیں۔

خوش مزاج، جاذب نظر، فرض شناس، احساس ذمہ دار

رشید امجد کے تخلیق کردہ کردار خوش مزاج، جاذب نظر، احساس ذمہ داری اور فرض شناسی سے لبریز ہیں۔رشید امجد کی کردار خوش مزاجی سے بھرپور ہیں۔زمانے کی تلخ حقیقت کو بھی اس قدر نرمی اور نفاست سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے سے لطف محسوس ہوتا ہے اور کرداروں کی خوش مزاجی نمایاں ہوتی ہے:

> ''رات دھیرے دھیرے شام کی پیالی میں کھل رہی ہے اور میں چسکی چسکی اس کی سیاہی اپنے اندر اتار رہا ہوں۔اس ضمن میں خاص طور پر آپ کو مرشد کا کردار ہر وقت ہنستا مسکراتا نظر آئے گا۔دفعتاً وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا یہ تو آخر ایک دن ہونا ہی ہے۔"(13)

مشکل سے مشکل حالات میں بھی ان کے کردار ہنستے مسکراتے نظر آتے ہیں۔ان کے افسانے دشت امکان کے کردار خاص طور پر ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے نظر آتے ہیں۔اس مذاق میں صرف مزاح نہیں بلکہ تنقید کا عنصر بھی کہیں کہیں نمایاں نظر آتا ہے۔

''جب میں نے ہاتھ بڑھا کر اٹھانا چاہا تو ماں ایک بار پھر جھرجھری لی ایک لمحے کیلئے جیسے خواب اس کی آنکھوں میں مجسم ہو گیا اس نے میری کلائی پکڑ لی۔۔وہ ہنس پڑا خزانے کے سانپ کی بات تو سنی ہے لیکن سانپ نے کلائی کب سے پکڑنا شروع کر دی۔"(14)

جاذب نظری رشید امجد کے افسانوں میں قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ان کے کرداروں کو دیکھ کر ایک حر کی فضا کی تخلیق ہونے لگتی ہے۔

یادیں میرے پاؤں میں گھنگرو باندھ کر چلتی ہیں اور میرے وجود کے اجڑے کھنڈر میں ناچنے لگتی ہیں چھن چھنا چھن۔۔۔"(15)

رشید امجد کے افسانوی کرداروں میں احساس ذمہ داری بھرپور ہے۔ان کے کردار سماجی مسائل کو حل کرنے اور اپنے ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ان کے کردار انسان نہیں لگتے بلکہ مشین کا ایک پرزہ لگتے ہیں جو کانوں کی مرمت پر انحصار کرتا ہے لیکن یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ فرد جس ٹوٹ پھوٹ کے معاشرے میں سانس لے رہا ہے جس بے توقیری کی بھینٹ چڑھا ہے کہ اس کے اندر کوئی شہر سلامت بچا بھی ہے کہ نہیں آنے والا وقت اس ٹوٹے پھوٹے انسان کی شخصیت اور اس کی شناخت پر کیا اثر ڈالے گا۔رشید امجد کی کہانیوں کے کردار باہمت ہیں۔اس کی بہترین مثال "نچی ہوئی پہچان" ہے۔

''پرندہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔دفعتا اس نے غوطہ لگایا اور دھند کا سینہ کاٹ کر سامنے آگیا۔اس کے پنجوں اور پر کو دیکھ کر جو ابھی تک چمک رہے تھے۔اس نے ایک نظر مجھے اور پھر چھٹے کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس پر جھپٹ پڑا۔میرے سارے بدن میں درد کی ٹیسیں دوڑ گئیں۔وہ پرندے کے پنجوں میں تڑپ رہا تھا۔"(16)

رشید امجد کے افسانوں کے کردار ہمدرد بھی ہیں۔وہ کسی آفت یا مصیبت سے گھبرا کر بھاگتے نہیں ہے بلکہ اپنے ساتھیوں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کی بہترین مثال نچی ہوئی پہچان کا ایک کردار ہے۔جب ایک دوست کو ایک بڑی بلا اپنے پنجوں میں دبوچ لیتی ہے دوسرا دوست اپنی جان بچانے کی بجائے اپنے دوست کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

''چھٹا ابھی تک اس کے پنجوں میں تڑپ رہا تھا۔میں تیزی سے اٹھا اور پرندے پر جھپٹ پڑا اس بار اس کی گردن میرے ہاتھ میں آگئی پرندہ بار بار پر جھٹک رہا تھ۔امیرے سارے بدن میں ٹیسیں اٹھ رہی

تھی لیکن میں پوری قوت سے اسے دباتا رہا۔اس نے اپنی زندگی کے پروانہ کی بلکہ اس آفت سے
سارے معاشرے اور اپنے دوست کو بچانے میں مگن ہو گیا۔''(17)

سماجی وسیاسی

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ تنہا نہیں رہ سکتا۔یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان رہے۔انسان کے اندر انسانی خصائص اور خصلتیں سماج کے اندر رہ کر ہی پیدا ہوتی ہیں۔تقریبا تمام ماہرین سماجیات کا ماننا ہے کہ انسان اور سماج کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے۔

انسان سماج کے بغیر نامکمل ہے۔اس کی شخصیت کی تعمیر لوگوں کے درمیان رہ کر ہی ہوتی ہے۔سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سماج اور معاشرہ میں رہ کر پیدا ہوتی ہے۔اسی طرح سماج کے وجود کے لئے انسان کا ہونا ضروری ہے۔سماج کا تصور جانور،چرند وپرند، درخت، پیڑ پودے اور ندی نالے کی موجودگی سے نہیں بنتا۔انسانی جماعت ہی ایک سماج کی تشکیل کرتی ہے۔اب یہ ایک الگ بحث ہے کہ انسان پہلے ہے یا سماج. لیکن جو چیز سب سے اہم ہے وہ یہ کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔یعنی اسے ہم ایسے بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان سماج کا پروڈکٹ ہے اور سماج کا تصور انسانی جماعت سے قائم ہوتا ہے

انسان ایک سماجی حیوان ہے۔رشید امجد کے افسانوں میں بھی سماجیت کا عنصر بھرپور نظر آتا ہے۔ان کے تمام فنی سفر میں ماں، بہن ،بھائی، بیوی اور بچوں کا تذکرہ ملتا ہے جو اس لحاظ سے محض تذکرہ نہیں رہتا کہ ان کا وجود اور حوالہ اپنے ساتھ ایک وسیع پس منظر لیے ہوئے ہے۔اس پس منظر کا ارتقاء فرد کی داخلی وذہنی کیفیت کے ساتھ منسلک ہے۔

یہ موضوع بھی ہیں اور کرداری علامتیں بھی اور ان کے توسط سے اسلوب میں بھی ایک انفرادیت اور جدت ابھرتی ہے۔اس جدت کی دونوں کیفیتیں ہیں ایک فرد کی ذہنی کیفیت کے حوالے سے جس کے ساتھ یہ کردار وابستہ ہے۔دوسرا ان کرداروں کی بات چیت، گفتگو ان کا طرز احساس اجتماعی زندگی کا کس طرح ترجمان اور نمائندہ ہے۔اس کی عکاسی بھرپور طریقے سے ہوتی ہے۔رشید امجد کے افسانوں میں معاشی اور سماجی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے ہر فرد مر رہا ہے تو گھر اور معاشرہ دونوں سے خوفزدہ ہے۔ان سے فرار پانے کے راستے تلاش کرتا ہے اس وقت موضوع اور فکر کے لحاظ سے اسلوب کا انداز مختلف ہے۔

"صبح ناشتہ کرتے ہوئے میں ماں سے کہتا ہوں میں آج شام روانہ ہو جاؤں گا۔وہ سر اٹھائے بغیر کہتی
ہے تمہاری تنخواہ کا کیا ہوگا؟ وہ ہر ماہ مجھے ملتی رہے گی۔"(18)

اسی طرح کی ایک اور مثال دیکھیں:۔

''میں سبزی کاٹنے والی چھری سے اپنا ہی ہاتھ کاٹ کر ماں کی جھولی میں پھینک دیتا ہوں۔وہ میری طرف دیکھے بغیر میرا کٹا ہوا ہاتھ اپنے پرس میں ڈال لیتی ہے۔ پھر کہتی ہے کہ تمہارا دوسرا ہاتھ بھی اچھا ہے مگر یہ مقدر کہاں ؟بہن کہتی ہے میرا کیا ہوگا؟''(19)

یہاں اسلوب کے حوالے سے بھی ناظر موضوع کی سچائی آشکار ہے بلکہ موضوع کی صداقت اور اس کے اثر میں بھی گہرائی کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔فرد کے ہاتھوں کا کٹنا بہن کا پوچھنا کہ میرا کیا ہوگا ماں کا مسکرانا تنخواہ کی بازپرس کرنا پرس کو مضبوطی سے پکڑنا یہ سب کی سب علامتیں ہیں۔فرد معاشی بوجھ تلے بری طرح دبا ہوا ہے۔

ان کے کرداروں کے حوالے سے صورتحال اسلوب میں اس وقت مختلف ہو جاتی ہے جب یہ کردار سماجی ناہمواریوں کا حوالہ بن کر فرد کی ذہنی اور کیفیات سے ٹکراتے ہیں یہاں فرد کا وہ داخلی انتشار عیاں ہوتا ہے جو خارجی زندگی قطرہ قطرہ اس کے اندر انڈیل رہی ہے۔

"بیوی نے غصے سے کہا۔آخری تاریخوں میں بیس آدمیوں کی چائے کا بندوبست کیسے ہوگا۔دودھ سات روپے اور چینی دس روپے کلو ہو گئی ہے۔"(20)

رشید امجد احساسات و کیفیات کی شدت ظاہر کرنے کے لئے متحرک الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔جس سے تاثر کی شدت کے ساتھ ساتھ گہرائی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

موضوع کی مناسبت سے اَب رشید امجد کے اُن افسانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں سیاسی و سماجی صورت حال کا عکس جھلکتا ہو۔اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن افسانوں کی نشاندہی کی جائے جن میں رشید امجد کا تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آتا ہے۔دشت امکاں، فنا دگی میں ڈولتے قدم،ڈوبتی پہچان،لیمپ پوسٹ،سمندر قطرہ سمندر،یاہو کی نئی تعبیر،گم شدہ آوازوں کی دستک،گملے میں اُگا ہوا شہر.....اور نہ جانے کئی اہم افسانے اُن کی شناخت قائم کرتے ہیں۔وہ صاحب اسلوب افسانہ نگار ہیں اور یہی ندرت اُن کی خاص پہچان ہے۔انتظار حسین کی طرح رشید امجد بھی ایسے ہی فن کار ہیں جو موضوعات کے برتاؤ کے ساتھ اسلوب کی وجہ سے بھی دور سے پہچان لیے جاتے ہیں۔رشید امجد کے اسلوب کی ایک خاص بات محسوس و غیر محسوس اشیا کی تجسیم ہے۔

وہ ایسے افسانہ نگار ہیں جو اپنے ابتدائی افسانوں سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔اس کی واحد وجہ فن پر گرفت اور ذہنی پختگی ہے۔مندرجہ بالا افسانوں کی بات کی جائے تو وہ اپنے معنیاتی نظام کے تحت تو سیدھے چلتے ہیں لیکن علامت نگاری کے جلوہ گری میں اپنے حقیقی مفہوم سے دور نکل کر نئے معانی وضع کرتے ہیں۔مثال کے طور پر اُن کی کہانی ''ڈوبتی پہچان'' کو ہی لیں جہاں کہانی کا مرکزی کردار اپنی ماں کی قبر کو پختہ کرانے کا ارادہ کرتا ہے اور اُسے عملی جامہ پہناتا بھی ہے لیکن وسوسے اُس پر سائے کی طرح منڈلانے لگتے ہیں۔

قبر پکی کرانے کے بعد مرکزی کردار کو تسلی نہیں ہوتی تو تمام قبروں کو پختہ کرا دیتا ہے محض اس وجہ سے کہ اُس کے ماں کی قبر

چھوٹ نہ جائے، لیکن وسوسے ہیں کہ اس کا ساتھ ہی نہیں چھوڑتے۔اب مرکزی کردار کے ذہن میں نیا وسوسہ سر اٹھانے لگتا ہے کہ آیا اُس کی ماں کی قبر اس قبرستان میں ہے بھی یا نہیں؟ قبر کی علامت کو رشید امجد نے نئی معنویت عطا کی ہے۔اس ضمن میں احمد اعجاز لکھتے ہیں کہ :

''معروف معنوں میں 'قبر'، خوف، دہشت اور فنا کی علامت ہے لیکن ہمارے کہانی کار نے 'بیزار آدم کے بیٹے' سے 'عام آدمی کے خواب' تک قبر کو علامتی اور استعاراتی سطح پر معانی و مفاہیم کے جو نت نئے پیرہن عطا کیے ہیں اس کی معمولی نظیر بھی پوری اردو افسانوی روایت میں نہیں ملتی۔(21)

رشید امجد کے افسانوں کے ذریعہ سیاسی جبر و تشدد کے ذریعے لوگ معاشرے میں اپنی شناخت گم کر بیٹھے ہیں۔یہ لوگ معاشرے میں آزادی کے خواہش مند، اپنی شناخت کے طلب گار اور عدم تحفظ کا شکار ہیں۔البتہ ان کے اندر جینے کی آرزو موجود ہے۔انہوں نے اپنے دور کے سماجی اور ذہنی انتشار کو افسانہ میں جگہ دی۔یہ تمام چیزیں موجودہ عہد کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی جبر کی علامتیں ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی کی رائے میں:

"رشید امجد نے نئے افسانے کو جن نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ان میں سب سے قابل ذکر طرز اظہار کی ایک شگفتہ پیچیدگی ہے جس کے پیچھے تخلیقی کشمکش کی ایک پوری دنیا آباد ہے۔"(22)

رشید امجد نے افسانوں میں اپنے عہد کے جبر، عدم تحفظ، تنہائی اور اجنبیت کی کیفیات کے خلاف کھل کر مزاحمت کی۔انہوں نے معاشرے کی مسخ شدہ چہروں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔انسانی وجود کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے عمل کو وہ اپنی ذات میں تلاش کرتے ہیں جس میں سمت کے گم ہو جانے کا احساس بہت نمایاں ہے۔ان کہانیوں میں پاکستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی تاریخ کا احاطہ ملتا ہے۔وہ عصری صورتحال کو سامنے لانے کے باوصف مزاحمتی رویوں کے نمائندہ ہیں۔انہوں نے افسانے کو ایک نیا رنگ اور آہنگ عطا کیا ہے۔جدید اردو افسانے کی تاریخ ان کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

رشید امجد کا افسانہ "گل والا" میں طبقاتی سماج اور بدصورتیوں کے مجموعہ کا نظام دکھایا گیا ہے۔اس نظام کی سب سے بڑی بدصورتی انسان دشمنی ہے۔طبقاتی سماج میں وہ طبقہ جو معاشرہ اور سماج کی تشکیل اور تعمیر و ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ڈال رہا ہوتا ہے معاشرے میں ان کا مقام اور نہ ہی عزت کا کوئی معیار ہوتا ہے اور استحصالی طبقہ معاشرے میں بلند مقام کا حامل بھی ہوتا ہے اور معزز و محترم بھی۔۔۔اس کہانی کا موضوع طبقاتی سماج کی کوکھ سے ہی جنم لینے والا وہ المیہ ہے جو شدید کرب کی صورت ہے۔طبقاتی سماج کی کوکھ سے جنم لینے والا المیہ وقت، زمانہ اور مقام کا پابند نہیں ہوتا۔المیے کا شکار ہو کر اپنا آپ گنوا دینے والے طبقے کا کوئی نام، شناخت اور پہچان نہیں ہوتی، اس پہ مستزاد طبقاتی سماج میں پسے ہوئے مظلوم طبقے کی عزت نفس لمحہ بہ لمحہ مجروح ہوتی رہتی ہے اور پھر جب عزت نفس ہی پامال ہو جائے تو بچتا کیا ہے؟

رشید امجد کے افسانوی بیانیوں میں موجودہ دور کی ایسی ہی طبقاتی کش مکش، نفسیاتی الجھنوں اور سماج کی ناہمواریوں کی تصویر کشی بڑے گہرے اور دلچسپ مثالی کرداروں کے ذریعے واضح انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ جن کو پڑھتے ہوئے قاری نئی جہات سے روشناس ہوتا ہے۔ رشید امجد کے نفسیاتی اور مثالی کردار قاری کے احساسات اور سوچوں کو گرفت میں لے کر انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

حوالہ جات

1. رشید امجد، بند کھڑکیوں پر دستک کے دوران خود کلامی، مشمولہ، گمشدہ آواز کی دستک، پشاور: ادارہ علم و فن، 1995ء، ص172
2. مجید مضمر، ڈاکٹر، رشید امجد کی افسانہ نگاری، چہار سو، ماہنامہ، جلد 7، شمارہ جنوری، فروری 1998ء ص17
3. رشید امجد، بے چہرہ آدمی، مشمولہ، بے زار آدم کے بیٹے، راولپنڈی: دستاویز پبلشرز، 1974ء، ص49
4. ایضاً، پچھلے پہر کی موت، ص71
5. اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 6، دانش گاہ پنجاب، لاہور: شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، ص428
6. انتظار حسین، ادب اور تصوف، مشمولہ، علامتوں کا زوال، دہلی: مکتبہ جامعہ نئی دہلی لیمیٹڈ، 2011ء، ص91
7. رشید امجد، انٹرویو قرۃ العین طاہرہ، مشمولہ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، ص135
8. ایضاً
9. رشید امجد، فنا دگی میں ڈولتے قدم، مشمولہ، دشت نظر سے آگے، کلیات، لاہور: مقبول اکیڈمی، 1991ء، ص۷۹
10. رشید امجد، فنا دگی میں ڈولتے قدم، ایضاً، ص۷۹
11. رشید امجد، ڈاکٹر، سمندر قطرہ سمندر (بے زار آدم کے بیٹے)، مشمولہ، دشت نظر سے آگے، کلیات، لاہور: مقبول اکیڈمی، 1991ء، ص241
12. ایضاً، ص161
13. ایضاً، شب مراقبہ کے اعترافات کی کہانیاں، ص198
14. ایضاً، دشت امکان، ص117
15. رشید امجد، ڈاکٹر، یاہو کی نئی تعبیر، ریت پر گرفت، مشمولہ دشت نظر سے آگے، ص320، 321
16. امجد طفیل، ڈاکٹر، رشید امجد کے بے مثال افسانے، زہد بشیر پرنٹرز: لاہور 2018، ص43
17. ایضاً، ص44
18. بے پانی کی بارش، ایضاً، ص263
19. ایضاً، ص265

20. ایضاً، سمندر مجھے بلاتا ہے، بھاگ رہے بیاباں مجھ سے، ص241
21. احمد اعجاز، (مرتب) رشید امجد کے منتخب افسانے، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء، صفحہ نمبر ۱۴
22. شمس الرحمن فاروقی، فلیپ، گملے میں اگا ہوا شہر (رشید امجد کے منتخب افسانے) رشید امجد اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، 2015